

محسن انسانیتؐ

از

جناب ابوالسلام نعیم صدیقی صاحب

[مندرجہ ذیل مقالہ دراصل برادر محرم جناب نعیم صدیقی صاحب کی زیر ترمیم کتاب
محسن انسانیت کے مقدمے کا ایک حصہ ہے۔ اس میں انہوں نے سیرت نبوی کے مطالعہ کے
لیے ایک صحیح نقطہ نظر کی نشان دہی کی ہے۔ خدا کرے کہ فاضل مصنف کو زبردست دامنِ امان کے
لمحات میسر ہوں اور وہ اپنی اس بیش قیمت تصنیف کو جس کے لیے دجا نے کتنی آنکھیں منظر
اور کتنے دل بیتاب ہیں، جلد از جلد پائیکل تک پہنچا دیں۔ ع۔ ج ص ۱]

پہنسی سے سیرت نبوی کا مطالعہ ہمارے ہاں اُس اسپرٹ اور اس نقطہ نظر سے کم ہو رہا ہے
جس سے ہونا چاہیے۔ ساری دلچسپی اس میدان میں پوری طرح یہ نہیں رہی کہ ہیں وہاں سے ایک نقشہ
زندگی حاصل کر کے اپنے آپ کو اس کے سانچے میں ڈھاننا ہے، بلکہ بعض دوسری دلچسپیاں بیچ
میں لگتی ہیں اور روز بروز بڑھ رہی ہیں۔

بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ساری دلچسپی بخود
صوبل ثواب کے لیے کرتے ہیں اور اس سے انکار نہیں کہ حضور سے قرب کی ہر کوشش خدا کی بارگاہ
میں پسندیدہ ہے اور اس پر اجر کی توقع رکھنی چاہیے۔ لیکن ایسی کوشش کا آدمین مدعا زندگی کو
سنوارنا بھی تو ہو۔ دھوم دھام سے میلاد کی غنچیں منقذ کی جاتی ہیں اور اس اعتقاد سے کہ جاتی
ہیں کہ ان مجالس میں حضور کی روح پرنور جلوہ گر ہوتی ہے اور اپنے پیروؤں کی محبت کے مظاہرین
کو دیکھ دیکھ کر خوشنود ہوتی ہے۔ شیرینی کے طشت، پھولوں کے گجرے اور ہار، توالی اور نعت خوانی

کے اہتمام، اگر مقبول اور لوہان کی خوشبوؤں کے مرغولے، قمقموں اور فانوس کی لمبے پاشیوں، یہ سب کچھ اسی اعتقاد کے ترجمان ہیں۔ سیرت نبوی سے اس انداز کی عقیدت جو نقشہ سامنے لاتی ہے وہ کسی انسان کا نقشہ نہیں، گوشت پرست سے بنے ہوئے کسی آدم زاد کی شخصیت نہیں بلکہ ہم ایک فوق الانسان ہستی سے متعارف ہوتے ہیں جس کا پیکر نور سے ڈھلا ہے جس کے جسم کا سایہ نہیں جس کے کارنامے میں سارا پارٹ مجزوں کا ہے، جو عالم اسباب کے قوانین سے بالاتر ہے، جس کے سارے کام فرشتے سرانجام دیتے ہیں اور جس کی ہر بات اور ہر چیز پر امر ہے۔ انکار نہیں کہ انہائے نوع کے مقابلہ میں حضور کا روحانی و اخلاقی پایہ بدرجہا بلند ہے، یہاں بہت سی فوق العادہ چیزیں بھی ملتی ہیں، وہاں معجزے بھی ہیں اور وہاں فرشتے بھی حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر بہر حال وہ پاک زندگی ایک انسان کی زندگی ہے اور اس کی عظمت کی اساس ہی یہ ہے کہ ایسی لامثال زندگی ایک انسان نے پیش کی۔ وہاں قوانین فطرت اور نوامیس تاریخ و مدنیت ہی کے دائرے میں سارا کام ہوتا ہے اور کامیابی کی راہ کے ایک ایک چھپے پر قرابانیاں پیش کی جاتی ہیں وہ ایک انسان کی زندگی ہو کر ہی ہمارے لیے اسوہ بنتی ہے اور اسی تصور کے ساتھ ہم اس سے اقتساب کر سکتے ہیں، اس سے عزم و بہمت کا درس لے سکتے ہیں، اس سے اصول کی پابندی اور فرض شناسی کا سبق سیکھ سکتے ہیں، اس سے انسانیت کی خدمت کا جذبہ اخذ کر سکتے ہیں اور اس سے بدی کی طاقتوں کے خلاف معرکہ آرا ہونے کے لیے ایک تڑپ اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں۔ سیرت نبوی کو اگر تم معجزہ بنا دو گے اور اگر اسے فوق الانسان کا رنگ دے دو گے تو پھر مٹی کے بنے ہوئے انسانوں کے لیے اس میں نمونہ کیا رہے گا۔ ایسی ہستی کے سامنے ہم مرعوب اور حیرت زدہ تو ہو سکتے ہیں اس کا کوئی پر تو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے۔ اس سے ہم عقیدت تو رکھ سکتے ہیں، اس کا اتباع نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جہاں جہاں عقیدت مندی کا یہ خاص رنگ پہنچا ہے نہ ہاں جتنا جتنا یہ گہرا ہوتا جاتا ہے، عملی زندگیاں اتباع نبوت سے اتنی ہی آزاد ہوتی جاتی ہیں۔ بلکہ اٹا حالت یہ ہے کہ گناہوں نے معاشی و معاشرتی

جرائم کے میکرے میں جو لوگ خم کے خم ٹنڈھاتے ہیں وہ اس سستے طرز سے مظاہرہ عقیدت کر کے اپنے مضطرب ضمیر کو اطمینان دلاتے ہیں کہ۔

”کچھ بھی ہیں، لیکن تیرے محبوب کی امت میں ہیں“

دوسری طرف مغرب سے ایک دوسرا رجحان اگھسا ہے، جسے اعظم پرستی (HERO WORSHIP) کہا جاتا ہے۔ یہ رجحان اپنی اصل روح کے اعتبار سے قوم پرستانہ جذبات کا ترجمان ہے۔ ایک طرح کا قومی تغافر ہے جو دوسروں کے سامنے ماضی کی نمایاں شخصیتوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ رجحان گویا یہ کہتا ہے کہ دیکھو ہمارے پاس ایسی اور ایسی ہستیاں ہیں، ہماری تاریخ میں اتنے اتنے بڑے پائے کے بزرگ ہو گزرے ہیں اور ان کے یہ یہ یادگار کارنامے ہیں جن کے ہم وارث ٹھہرے ہیں اور جو ہمارے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔ اس رجحان کی علامت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ کھوکھلا ہوتا ہے۔ اس کے تحت ہر قوم متعدد شخصیتوں کے ایام وفات، ایام پیدائش اور دوسرے یادگاری دن بڑے ٹھاٹھ سے مناتی ہے۔ مگر یہ ایام کہیں بھی ان شخصیتوں سے استفادہ کا ذریعہ نہیں بنتے انسانیت کے جن نمونوں کو بہ حد تغافر دوسروں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ان کا کوئی پر تو پیش کرنے والوں کی اپنی زندگیوں میں دکھائی نہیں دیتا اور نہ کبھی اس پر تو کو راخرا کرنے پر توجہ ہوتی ہے۔ اس رجحان کے تحت حضور کی یاد تازہ کرنے کے لیے جو تقاریب منعقد ہوتی ہیں ان میں کہنے کو تو ایک خاص طرح کی باتیں ہمیشہ کہی جاتی ہیں مگر زندگی پر ان کا کوئی اثر نمودار نہیں ہوتا۔

تیسرا غلط نقطہ نظر وہ ہے جو حضور کے پیغام کو ایک نظام حیات کا پیغام نہیں سمجھتا بلکہ ایک مذہب کا پیغام قرار دیتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے جو لوگ متاثر ہیں ان کا تصور یہ ہے کہ حضور بس چند اعتقاد، چند رسوم عبادات، چند اور ادو وظائف، چند اخلاقی سفارشیں اور چند فقہی احکام پہنچانے آئے تھے۔ اور آپ کا منشا ایسے افراد پیدا کرنا تھا جو شخصی طور پر مسلمان کی شان پیدا کر کے ہر گندے سے گندے نظام کے لیے بہترین کارکن ثابت ہوں۔ ایسا عنصر

حضور سے پس طہارت، نماز و روزے، نواقل واذکار اور انفرادی اخلاق کی حد تک اکتساب فیض کرتا ہے، لیکن تمدنی زندگی کے وسیع تر معاملات میں وہ پوری شان بے حسنی کے ساتھ ہر ماحول کے کام آتا ہے اور ہر فساد کے ساتھ سازگاری کر لیتا ہے۔ اس عنصر نے گویا سیرت نبوی کی مقدس کتاب کے بے شمار زیریں ابواب کو فراموشی کی سرزمین میں دفن کر دیا ہے اور بس ایک مقدمہ کی فصل کو لے کر اسی میں کھو گئے ہیں۔ اس عنصر نے اب تک حضور کی جزیرہ جانی کی ہے اس سے متاثر ہو کر دور ہر حاضر کی کوئی غیر قوم تو کجا، خود تعلیم یافتہ نوجوان مسلم تک یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حضور ان کے لیے قافلہ سالار تمدن بھی ہو سکتے ہیں اور ان کی بارگاہ سے تازہ ترین کٹھن مسائل کا کوئی اطمینان بخش حل ہی مل سکتا ہے۔ یہ نقطہ نظر بھی حضور کی سستی کے لیے ایک مقدس حجاب بن گیا ہے۔

یہ غلط نقطہ ہونے نظر نیچ اس لیے رہے ہیں کہ فضا ان کے لیے سازگار ہے۔ نصایب اور سازگار ہے کہ جس نظام سیاست و تمدن اور جس ہدایت معیشت و معاشرت سے ہم دوچار ہیں۔ ایک خاص نقشے کا انسان دوکار ہے۔ اس مشین کو خاص ڈھنگ کے پرزوں کی ضرورت ہے۔ وہ بالکل دوسری ہی سیرت افراد میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا کام ایک اور ہی طرز کے ذہن و دروازے چلتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں عملی زندگی کو سرے سے اس نمونہ انسانیت کی ضرورت ہی نہیں ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پیش کرتی ہے اور اس منڈی میں اس متنازع نکتہ عمل کی مانگ ہی نہیں ہے جو آنحضرت کی زندگی سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا اجتماعی نظام جس طرز کے فدیہ اور حکام، حج اور دیکھل، لیڈر اور صحافی، سپہ سالار اور سپاہی، کوٹوال اور پیادے، تحصیل دار اور شہزادی، ڈاکچی و ستر اور نمبردار، زمیندار اور فزاع، مصنف اور ادیب اور عام قلمی اور ضروری مانگتا ہے ان کا نقشہ انسانیت اس سے بالکل متضاد و قسم کا ہے جس کا مظاہرہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ کے اسٹیج پر فرمایا۔ چھٹے ہونے نظام کی مانگ کے مطابق گھر گھر میں ماڈرن کی محبت کی گودیں اور باپوں کی شفقت کی نگاہیں اولادوں کو پال رہی ہیں۔ اس کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر ادارہ ہائے تعلیم و تربیت میں بیس سال تک ایک ایک فرد پر صرف کر کے کام کے پرزے بنا رہے ہیں اور اسی کے تقاضوں کے تحت ہر

صاحبِ شہر خود اپنے ذہن و کردار کو ایک خاص شکل دینے میں ساری عمر مصروف رہتا ہے۔ یہ نظام جن جن چیزوں کو پسند کرتا ہے انہی کو معاشرہ اپنے افراد میں از خود پیدا کرتا رہتا ہے اور یہ جن جن چیزوں کو مخالفت و کراہت سے دیکھتا ہے، ماحول کی پوری طاقت ان کو مٹانے کے درپے رہتی ہے۔ یہ نظام جس بولی کو پسند کرتا ہے زبانیں آپ سے آپ اسی بولی کو بولنے لگتی ہیں، یہ جس لباس کو پسند کرتا ہے وہ لباس از خود ذریعہ بدن ہونے لگتے ہیں، یہ ایک اشارہ کرتا ہے تو قدیمی حیا دار گھرانوں کی بہو بیٹیوں کے سپردوں سے نقابیں اٹ جاتی ہیں۔ عزت کی روش وہ ٹھہرتی ہے جسے مرد و بر نظام راج کرنا چاہے اور ذلت کا طرز وہ قرار پاتا ہے جسے چلتا ہوا تمدن ناپسند کرے۔ جن فنون کو یہ پسند کرتا ہے وہ ذریعہ مقبولیت بنتے ہیں اور جن مشاغل کو یہ مسترد کرتا ہے وہ مذہبِ تغافل ہو جاتے ہیں۔ یہ اپنی اقدار خود بنانا اور تمام افراد سے انہیں منوانا ہے اور دوسری تمام دایا اقدار اور شعائر کو مرہم جانا پڑتا ہے کچھ محبت و راز افراد اور خاندان ماحول کے جبری دھانے کے خلاف زور دیتے ہیں، مگر معاشی محرومی، ثقافتی پیمانہ نگاری اور احساسِ بہتری کا دباؤ اتنا سخت ہوتا ہے کہ ذلت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہیراک مضمحل ہو کر اپنے آپ کو ماحول کے حوالے کرتے جاتے ہیں، ورنہ ان کی اگلی نسل بہت چھوڑ بیٹھتی ہے۔ اب ایک دنیا کی دنیا جو اپنی سیرت کی تشکیل شعوری طور پر بھی اور غیر شعوری طور پر بھی ماحول کے نش کے مطابق کرنے میں لگن ہے۔ وہ سرورِ عالم کی سیرت پر کتابیں لکھے اور پڑھے گی اور عظمت سائے اور سننے گی تو اسوۂ حسنہ کا ذوق لوگوں کے اندر اُٹے گا کہاں سے؟

سچی بات یہ ہے کہ سیرتِ نبوی میں ان لوگوں کے لیے کوئی پیغام ہے ہی نہیں جو کسی غیر اسلامی نظام سے بات بنا رکھنا چاہتے ہوں اور جن کے مفاد کے سروے کسی باطل سے چمک گئے ہوں۔ یہ لوگ سیرتِ پڑھ کر مردِ مٹھتے ہونگے، ان کو ذہنی حظ ملنا ہوگا، ان کی معلومات میں ایسا نہ ہوتا ہوگا لیکن ان میں یہ تحریک کہاں سے آئے گی کہ وہ اس سیرت کے سانچے میں زندگی کو ڈھالیں۔ ان کا محمودی طرز ٹوٹ نہیں سکتا۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی داستانِ حیات رستم و ہر اب کا قصہ نہیں انجیل

کی کہانی نہیں اور کسی خیالی کردار کا افسانہ نہیں۔ اس کا مقام یہ ہرگز نہیں کہ اسے ہم علم و ادب کی تفریحی جوہر پال کا محض ایک سرمایہ رونق بنائیں۔ اس کی قدر و قیمت اجازت نہیں دیتی کہ ہم اسے محض ذہنی لذت حاصل کرنے کے لیے استعمال کریں۔ اس کا احترام روکتا ہے کہ ہم اسے مجرد قومی تفاخر کے جذبہ کی تسکین کا ذریعہ بنائیں۔

یہ مختلف غلط نقطہ ہاتھ نظر ہمارے یہاں مل جل کر کام کر رہے ہیں اور یہی اصل مقصد میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ کون شمار کر سکتا ہے کہ ہر سال کتنی مجالس میلاد اور جلسہ ہائے سیرت ہمارے ملک میں منعقد ہوتے ہونگے؟ ایک ربیع الاول ہی کے مہینے میں کتنے وعظ اور کتنی تقریریں ہوا میں لہریں اٹھا دیتی ہونگی؟ کتنے مقالے اور کتابیں لکھی جاتی ہونگی؟ کتنے جرائد کے خاص نمبر اس موضوع پر شائع ہوتے ہوں گے؟ شعرا کتنی نعتیں لکھتے ہوں گے اور خوال ان کو کہاں کہاں گاتے پھرتے ہونگے؟ اکابر کی طرف سے کتنے سی پیغامات اور بیانات نشر ہو جاتے ہوں گے؟ دعوتوں اور ضیافتوں کی کیسی کچھ بہاریں دسترخوانوں پر آتی ہوں گی؟ بازاروں کو سجانے اور دروانے اور محرابیں بنانے میں کتنا روپیہ کھپا دیا جاتا ہوگا؟

لیکن دوسری طرف یہ بھی تو ذرا سوچیے کہ ایک اچھے مقصد پر قوتوں اور روپیے کے اس صرف کا واقعی نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ جائزہ کی ترازو کے ایک پڑے میں اپنی ایک سال کی ان سرگرمیوں کو رکھیے اور دوسرے پڑے میں حاصل شدہ نتائج کو رکھ کر جانچیے کہ کیا وزن ٹھیک نکلتا ہے؟ کتنے افراد ہونگے جو ان نیک مساعی کی بدولت سیرت نبوی کے سانچے میں اپنی زندگیاں ڈھالنے کی مہم میں ہر سال لگ جاتے ہونگے؟ اگر ایک جلسے اور ایک مقالے اور ایک نعت کے ذریعے صرف ایک ہی آدمی بدلا ہوتا تو اندازہ کیجیے کہ گذشتہ دو سو سال کا کیا حاصل ہونا چاہیے تھا؟ اور اگر عملاً حاصل

۱۰ آہستہ آہستہ نبی اکرم کی یادگار تقریبوں میں مسرت و تفریح اور کھیل تماشوں کا عنصر بہت بڑھتا جا رہا ہے، بلکہ کھلے کھلے ہنگامہ ہائے فستی و مجور بھی عمل میں آنے لگے ہیں یعنی معاشرہ ٹھیک اس پیغام کے اٹنی سمت چل پڑا ہے جو سیرت میں مضمر ہے۔

وہ نہیں ہے تو کہیں نہ کہیں ہماری مساعی میں کوئی کوتاہی موجود ہے اور وہ کوتاہی بڑی بنیادی قسم کی ہے میرا حاصل مطالعہ و تحقیق یہ ہے کہ ہم نے مطالعہ سیرت کا صحیح بنیادی نقطہ نظر کم کر دیا ہے اور اوپر کے غلط نقطہ ہائے نظر کار فرما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرکارِ دو عالم کی محبت و عقیدت کے بے شمار مظاہر جو بچپن کے باوجود اور سیرت پر دماغی کاوشیں صرف ہونے کے باوجود ہماری تاریخ کے افق سے وہ نیا انسان طلوع نہیں ہو رہا جس کا نمونہ کامل حضور پاک نے پیش فرمایا تھا۔

حضور کی سیرت ہمارے اندر بجز اس کے کسی طرح جلوہ گر نہیں ہو سکتی کہ ہم اسی نصب العین کے لیے ایسی ہی جدوجہد کرنے اٹھیں جس کے لیے حضور کی پوری زندگی کو ہم وقف پاتے ہیں۔ وہی جدوجہد اپنے ڈھب کی سیرت پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہو سکتی ہے اور مصرف بھی !!

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ایک فرد کی سیرت نہیں ہے بلکہ وہ ایک تاریخی طاقت کی داستان ہے جو ایک انسانی پیکر میں جلوہ گر ہوئی۔ وہ زندگی سے کٹے ہوئے ایک درویش کی سرگزشت نہیں ہے جو کنارے بٹھیک کر محض اپنی انفرادی تعمیر میں مصروف رہا ہو۔ بلکہ وہ ایک ایسی ہستی کی آپ بیتی ہے جو ایک اجتماعی تحریک کی روح درواں تھی۔ وہ محض ایک انسان کی نہیں، ایک انسان کی روداد ہے۔ وہ عالمِ نو کے معمار کے کارنامے پر مشتمل ہے۔ ایک پوری جماعت، ایک انقلابی تحریک اور ایک سہیت اجتماعیہ اس کارنامے کی تفصیل اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ سرورِ عالم کی سیرت غارِ حرا سے لے کر غارِ ثور تک، حرمِ کعبہ سے لے کر طائف کے باناز تک، اہمات المؤمنین سے جہوں سے لے کر میدانِ ہائے جنگ تک چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے نقوش بے شمار افراد کی کتابِ حیات کے اوراق کی زینت ہیں۔ ابو بکر و عمر، عثمان و علی، عمار و یاسر، خالد و خویلد اور بلال و صہیب رضوان اللہ علیہم اجمعین سب کے سب ایک ہی کتابِ سیرت کے اوراق ہیں ایک چین کا چین ہے کہ جس کے لالہ و گل اور رنگس و نرسن کی ایک ایک تپتی تپتی پر اس چین کے مالی کی زندگی مرقوم ہے۔ وہ قافلہ بہاری وقت کی جس سرزمین سے گزرا ہے اس کے ذرے ذرے پر نگہت کی ہر ثبت کر گیا ہے۔

دینا کی اس بلند ترین شخصیت کو اگر سیرت نگاری میں مجرد ایک فرد بنا کے پیش کیا جائے اور سوانح نگاری کے مروجہ طرز پر اس کی زندگی کے بڑے بڑے کاموں، اس کی نمایاں کمالات اور اس کے اخلاق و عادات کو بیان کر دیا جائے، کچھ تاریخوں کی چھان بین اور کچھ واقعات کی کھجور کھد کر دی جائے تو یہی سیرت نگاری سے صحیح منشا پر گز پورا نہ ہوگا۔

پھر سرورِ عالم کی زندگی کی مثال ایک جوہر کے کھڑے پانی کی نہیں ہے کہ جس کے ایک کنارے کھڑے ہو کر ہم بیک نظر اس کا جائزہ لے سکیں۔ وہ ایک جتنا ہیڑا دریا ہے جس میں حرکت ہے، روان ہے، کشش ہے، موج و جواب ہیں، سپیدیاں اور موتی ہیں، اور جس کے پانی سے مردہ کھیتوں کو مسلسل زندگی مل رہی ہے۔ اس دریا کا درخشاں ہونے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ رواں رہنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ سیرت کی بہت سی کتابیں پڑھ کر نادر معلومات ملتی ہیں، لیکن ہمارے اندر تحریک پیدا نہیں ہوتی، جذبے انگیزی نہیں دیتے، عزم و محبت کی رگوں میں نیا خون نہیں دھرتا، ذوقِ عمل میں نئی حرارت نہیں آتی، ہماری زندگیوں کا محور نہیں ٹوٹتا۔ وہ شرار آرزو ہم اندر نہیں کہرتے جس کی گرمی نے ایک یلہ دہنا اور بے سرو سامان فرد کو قرونوں کے جھے ہوئے نامرد نظام کے خلاف مکرر آواز کر دیا۔ وہ سوز و ساز ایماں ہیں نہیں مٹا جس نے ایک تیمم بے نوا کو عرب و عجم کی تمستوں کا فیصلہ کرنے والا بنا دیا۔

اصل میں حضورِ معروف اصطلاح کے محدود تصور کے مطابق فقط ایک "بڑے آدمی" نہ تھے۔ آپ کی سیرت ایک ایسے "بڑے" یا "مشہور" آدمی کی داستان نہیں ہے۔ جیسے لوگوں کو مشاہیر کے سوانحی مسلوں میں گنویا جاتا ہے۔ یہ سبھی بڑے اور مشہور آدمیوں سے بہت اوپر کی ہے۔ دنیا میں بڑے آدمی بہت پیدا ہوئے اور ہوتے ہیں۔ بڑے لوگ وہ بھی ہیں جنہوں نے کوئی اچھی تعلیم اور کوئی تعمیری فکر پیش کر دی، وہ بھی ہیں جنہوں نے اخلاق و تقاضوں کے نظام ہوسچے، وہ بھی ہیں جنہوں نے اصلاحِ معاشرہ کے کام کیے، وہ بھی ہیں جنہوں نے ملکِ فتح کیے اور بہادرانہ کارناموں کی میراث چھوڑی، وہ بھی ہیں جنہوں نے سلطنتیں چلائیں، وہ بھی جنہوں نے قہر و درویشی

کے عجیب عجیب نمونے ہمارے سامنے پیش کیے، وہ بھی ہیں جنہوں نے دنیا کے سامنے انفرادی اخلاق کا اونچے سے اونچا معیار قائم کر دکھایا۔ مگر ایسے بڑے آدمیوں کی زندگیوں کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو بالعموم یہی دیکھتے ہیں کہ ان کی قوتوں کا سارا بس زندگی کی کسی ایک شاخ نے چوس لیا اور باقی ساری ٹہنیاں سوکھی رہ گئیں۔ ایک پہلو اگر بہت زیادہ روشن مٹا ہے تو کوئی دوسرا پہلو تاریک دکھائی دیتا ہے، ایک طرف افراط ہے تو دوسری طرف تفریط! لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر گوشہ دوسرے گوشوں کے ساتھ پوری طرح متوازن بھی ہے اور پھر ہر گوشہ ایک ہی طرح کے کمال کا نمونہ ہے۔ جلال ہے تو جمال بھی ہے، روحانیت ہے تو مادیت بھی ہے، معاد ہے تو معاش بھی ہے، دین ہے تو دنیا بھی ہے، اک گونہ ہے خودی بھی ہے مگر اس کے اندر خودی بھی کا فرما ہے، خدا کی عبادت ہے تو اس کے ساتھ بندوں کے لیے محبت و شفقت بھی ہے، کڑا اجتماعی نظم ہے تو فرد کے حقوق کا احترام بھی ہے، گہری مذہبیت ہے تو دوسری طرف ہمہ گیر سیاست بھی ہے تو قوم کی قیادت میں انہماک ہے مگر ساتھ کے ساتھ از دو ابی زندگی کا بھٹیرا بھی نہایت خوبصورتی سے چل رہا ہے، مظلوموں کی داد دہی ہے تو ظالموں کا ہاتھ پکڑنے کا اہتمام بھی ہے۔

آپ کی سیرت کے مدرسے سے ایک حاکم، ایک امیر، ایک وزیر، ایک افسر، ایک ملازم ایک آقا، ایک سپاہی، ایک تاجر، ایک مزدور، ایک حج، ایک معلم، ایک داعی، ایک لیڈر، ایک ریٹائر، ایک فلسفی، ایک ادیب، ہر کوئی حکیمانہ درس حکمت و عمل نے سیکھا ہے۔ وہاں ایک باپ کے لیے، ایک بیٹے کے لیے، ایک بھائی کے لیے، ایک شوہر کے لیے، ایک دوست کے لیے، ایک ہم سفر کے لیے، ایک پڑوسی کے لیے یکساں مثالی نمونہ موجود ہے۔ ایک بار جو کوئی اس مدرسہ کا طالب ہے، پھر اسے کسی دوسرے دروازے کو ٹھٹھکانے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ انسانیت جس آخری کمال تک پہنچ سکتی تھی وہ اس ایک ہستی میں جلوہ گر ہے اسی لیے میں اس ہستی کو انسانِ اعظم کے لقب سے پکارنے پر مجبور ہوا۔ تاریخ کے پاس انسانِ اعظم صرف یہی ایک ہے جس کو چراغ بنا کر ہر دور میں ہم ایمان حیات کو روشن کر سکتے ہیں۔ کورڈوں

افراد انسانی نے اس سے روشنی لی، لاکھوں بزرگوں نے اپنے علم و عمل کے دیے اسی کی نو سے جلدے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں اس کا پیغام گونج رہا ہے اور دس دس کے تمدن پر گہرے اثرات اس کی دی ہوئی تعلیم کے پڑے ہیں۔ کوئی انسان نہیں جو اس انسانِ اعظم کا کسی نہ کسی پہلو سے زیرِ بار احسان نہ ہو۔ لیکن اس کے احسان مند اس کو جانتے نہیں، اس سے تعارف نہیں رکھتے اس کی ہستی کے تعارف اور اس کے پیغام کے فروغ کی ذمہ داری اس کی قائم کردہ جماعت پر تھی، لیکن وہ جماعت خود ہی اُس سے اور اس کے پیغام سے دُور جا پڑی ہے۔ اس کے پاس کتابوں کے اوراق میں کیا کیا کچھ موجود نہیں، لیکن اس کی کھلی ہوئی کتابِ عمل کے اوراق پر انسانِ اعظم کی میرت کی کوئی تصویر دکھائی نہیں دیتی۔ اس جماعت اور قوم کی مذہبیت، اس کی سیاست اس کی معاشرت، اس کے اخلاق، اس کے قانونی نظام اور اس کے کلچر پر اس میرت کے بہت ہی دھندلے نشانات باقی رہ گئے ہیں اور وہ بھی بے شمار نئے نئے نقوش میں خلط ملط ہو کر مسخ ہو رہے ہیں۔ اس جماعت یا قوم کا اجتماعی ماحول زمین کے کسی ایک چتے پر بھی یہ گواہی نہیں دیتا کہ میں محمد کے دیئے ہوئے اصولوں اور اس کی قائم کردہ روایات و اقدار کا آئینہ دار ہوں۔ بلکہ الٹا یہ جماعت اور یہ قوم دنیا کے مختلف فاسد نظاموں کے دروازوں پر جھیک مارتی پھرتی ہے اور ہر قائم شدہ طاقت سے مرعوب ہو ہو کر اپنے سرمایہٴ افتخار پر شرمسار ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے قرآن کو غلاموں میں لپیٹ دیا اور انسانِ اعظم کی میرت کا گھدستہ بنا کر طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔

دوسرا غضب یہ ڈھایا کہ اپنے آپ کو ایک مذہبی و قومی جتھے میں بدل کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو محض اپنے قومی و مذہبی رہنما کی حیثیت دے دی اور اس بین الاقوامی سبق کے پیغام اور نمونہ حیات کو گروہی اجارہ بنا لیا۔ مالا لنگہ آپ ساری انسانیت کے رہنما بن کر آئے تھے اور ساری انسانیت کے لیے پیغام اور نمونہ لائے تھے۔ ضرورت میرت کو اس انداز سے پیش کرنے کی تھی کہ انسانیت کا یہ ایک نمونہ ہے کہ جس کے سانچے میں ڈھل کر انسان اپنے اور اپنے اپنے نوع

کی فلاح کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اور مسائل کے گونا گوں خازنوں سے نجات پا کر ایک پاکیزہ نظام زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ حضور کا پیغام اور اسوہ درحقیقت سجد کی روشنی اور بارش کے پانی اور ہوا کے جھونکوں کی طرح کائنات میں عام تھا، لیکن اسے ہم نے اپنی نااہلی سے گروہی خول میں بند کر لیا۔ آج افلاطون، متقراطہ، ڈارون، میکیا ویلی، مارکس، فرآڈ اور آئنسٹائن سے تو ہر ملک و مذہب کے لوگ تھوڑا یا بہت استفادہ کرتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے کسی کے خلاف کسی گروہ میں اندھا تعصب کارفرما نہیں ہے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور اور علم اور رہنمائی سے استفادہ کرنے میں بے شمار تعصبات حائل ہیں۔ لوگ یوں سوچتے ہیں کہ محمد تو مسلمانوں کے ہیں اور مسلمان ہم سے الگ اور ہم مسلمانوں سے الگ ہیں، لہذا مسلمانوں کے باہر سے ہمارا کیا واسطہ! افسوس ہے کہ اس تاثر کے پیدا ہونے اور غیر معمولی حد تک جانچنے میں ہمارے اپنے طرز عمل کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ خود ہم ہیں کہ جنہوں نے محسن انسانیتؐ کی نہایت غلط فہمائی کی ہے۔

سرورِ عالم کی مستی تاریخِ انسانی کے دو بڑے ادوار کے درمیان واقع ہے۔ بہشتِ محمدی کے مقام سے کھڑے ہو کر دکھیں تو ہمارے پیچھے قبائلی، جاگیر دارانہ، بادشاہتی اور روایتی و اولامی دور تمدن پھیلا دکھائی دیتا ہے۔ سامنے دکھیں تو آفاقی و بین الاقوامی، عوامی و جمہوری، عقلی و استدلالی، ترقیاتی و ایجادی دور تمدن کی پہلی شعاعوں کا ناقصہ دور کے افق سے اُمتا دکھائی دیتا ہے۔ اس دورِ عقل و ترقی کا افتتاح خود ستر تاج انسانیت ہی کے ہاتھوں کر آیا گیا اور نئے دائرے دور کے لیے ایسے اصول دنیا کو فراہم کر دیئے گئے جو قیامت تک کارگر ہو سکیں اور ان اصولوں کے ساتھ ایک ایسا انسان تیار کر کے دکھایا گیا جو آنے والی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے قابل ہو سکے۔ حضور کے ذریعے اسی آنے والے دور کی ضروریات کے لحاظ سے روح اور بدن، اخلاق اور مادیت، عقلیت اور جذبات، اعتقاد اور عمل، خواہش اور فرض، فرد اور جماعت کے احوال اور تقاضوں کے درمیان معجزانہ نوعیت کا توازن قائم کر دیا گیا۔ آپ کے ہاتھوں ایک ایسی جماعت کی تاسیس کرائی گئی جو ایک طرف دنیا سے بے نیاز تھی اور دوسری طرف دنیا پر حکمرانی

کرتی تھی، ایک طرف خدا پرستی میں بے مثال تھی اور دوسری طرف مادہ پر کار فرمائی کرنے کے لحاظ سے پیش پیش تھی، ایک طرف حق کے مقابلے میں انتہائی عاجزی سے سر جھکا دینے والی تھی اور دوسری طرف باطل کا زور توڑنے کے لیے جان و مال کی بازی لگا دینے والی تھی، ایک طرف اپنے آپ کو مندانے الہی کی تحویل میں دیتے ہوئے تھی اور دوسری طرف فطرت کی قوتوں کو رام کر کے ان سے کام لینے میں چاتی و چوبند تھی۔ یہ طاقت جو نبی تاریخ کے ایوان میں داخل ہوئی اس نے علم و حکمت کے فانوس روشن کر دیئے، اس نے ایجادات کے دروازے کھول دیئے اور ان نے ادارات کی تنظیم کے نئے نئے تجربات نہایت تیزی سے کر ڈالے اور اس کی ساری حرکت، اس کی ساری ترقیات، اس کے علوم اور ایجادات، اس کے تمدنی و تہذیبی کارناموں کا اصل کریڈٹ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ مغربی قومیں جن کے قبضے میں آگے چل کر اس عقلی و جمہوری دور کی باگ ڈور آئی، محمد اور اس کے پیغام اور اس کے پیش کردہ نظام کو نہ سمجھ سکے۔ وہ ہستی جس کا کارنامہ مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے پس منظر میں جگمگا رہا ہے اور وہ ہستی جو جمہوریت اور بین الاقوامیت کے پردوں کے پیچھے مکر رہی ہے اور وہ ہستی کہ جس کا ہاتھ مذہبی اصلاح (REFORMATION) کی تحریک کی ڈور ہلانے والا تھا اس کو یورپ کا روشن دماغ انسان نہ دیکھ سکا اور نہ سمجھ سکا! اس کے کئی اسباب ہیں اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں اجمالاً ان اسباب کا ذکر کریں:

۱۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنا پیغام لے کر اٹھے تو آپ کو یہودیوں اور عیسائیوں دونوں سے سابقہ پیش آیا۔ دونوں مذہب اس وقت فساد اور انحطاط کے افسوسناک دور سے گزر رہے تھے، ایمانی و اخلاقی رُوح سے خالی ایک رسمیتی ڈھانچہ شانِ تقدس کے ساتھ دونوں کے پاں بکھڑا تھا، دونوں گروہوں میں مذہبی طبقات پیدا ہو چکے تھے اور انہوں نے کاروباری ذہن کے ساتھ اپنے مفاد کی دکانیں کھول لی تھیں۔ فکر و عمل کی حقیقی متاع لٹ چکی تھی، صرف باہر حکمپار سائن بورڈ آویزاں تھے سارا زور اپنی اپنی گروہ بندی کو قائم رکھنے اور اپنے اپنے آدمیوں کو اس کے دائرے میں روک رکھنے

پر تھا۔ تہذیب کی اصلاح اور آدمیت کا جھلاسی کے سامنے نہ رہا تھا۔ ان حالات میں بہ حیثیت مجموعی یہودیوں اور عیسائیوں کی ذہنیت اتنی بگڑ چکی تھی کہ انہوں نے محمد کی قیمتی شخصیت کو جانچنے اور اس کے پیغام کو پرکھنے اور اس کے پیش کردہ نظام کا جائزہ لینے کے بجائے اس کے خلاف ضد اور تعصب اور حسد اور کینہ کے محاذ قائم کر لیے۔ اس کی دعوت کا مقابلہ کیا، اس کی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکائے، اس کے ساتھ عہد شکنیاں اور غداریاں کیں، اس کی تعمیر کو ڈھا دینا چاہا اور اس کے قتل کی تدبیریں کیں۔ پھر اپنے ان کرتوتوں کے فطری نتائج سے جھوٹیاں بھریں۔ اس طرح تاریخ کے بہتے پانی کو گندے جذبات اور گھٹیا حرکات سے گدلا کیا اور یہی گدلا پانی بہ نہر بعد کی نوں تک پہنچا۔ انہوں نے کینے اور تعصب کی ایک میراث پیدا کی اور وہ میراث بعد کے یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے محفوظ چھوڑ گئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی فاسد جذباتی رد عمل آج تک ان کے اخلاف کے ذہنوں میں منعکس ہو رہا ہے۔

۲۔ اسلام سے قبل کی انسانی دنیا کے اندر مذہبی دائرے میں بھی اور سیاسی میدان میں بھی عیسائیوں کو نمایاں غلبہ حاصل تھا اور پھیلاؤ کی امنگیں کام کرنے کے لیے بڑی وسیع جولانگاہ سامنے رکھتی تھیں۔ لیکن اسلام کے ابھرنے سے گویا ان کی نگاہ میں ایک حریف طاقت آجھری اور آہستہ آہستہ نشوونما پا کر دنیا بھر میں ایک فیصلہ کن طاقت بن گئی۔ اس وجہ سے عیسائیت کے سینے میں رقیبانہ جذبات پیدا ہو کر بڑھتے ہی چلے گئے۔ پھر عملاً اسلام کی طاقت نے عیسائیت کے ہاتھوں سے تسلط و اقتدار کی باگئیں کرہ ارضی کے مختلف حصوں میں چھین کر اس کے رد عمل کو اور زیادہ شدید بنا دیا۔ تاریخ کے میدان میں کھلے اور برابر برابر کے مقابلے میں عیسائیوں نے اسپورٹس میں اسپرٹ دکھانے کے بجائے اپنے اندر ایک کد اور ایک چتر پیدا کر لی۔ یہ کد اور چتر بنیادی طور پر مسلمانوں کے خلاف تھی اور بالواسطہ طور پر اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کھچاؤ بڑھتا گیا۔ یہ کھچاؤ مہلبلی جنگوں کے دور میں اپنی آخری انتہا تک جا پہنچا۔ اس دور تک آتے آتے

چونکہ خود مسلمانوں میں انحطاط اپنا عمل کر چکا تھا اس لیے ان کی خاص خاص کمزوریاں اور بے ادبیاں اسلام اور سرورِ عالم کے ساتھ منسوب کی جانے لگیں اور مسلمانوں کے عمل و کردار کے رنگوں سے سیرتِ محمدی کی ایک غلط تصویر تیار کی جانے لگی۔

۳۔ اسلام اور عیبِ بیت کے اس لمبے دورِ کشمکش کے ابتدائی حصے میں پادری گروہ چونکہ اپنے عیسائی عوام کو ذہنی لحاظ سے کامل طور پر اپنے تصرف میں لیے ہوئے تھا اور اسلام ہی گروہ کے طبیعتاتی مفاد پر ضرب لگانے کا موجب بنوا تھا، اس لیے اس گروہ نے محسنِ انسانیت اور اس کے پیغام کا ایک جھوٹا تصور گھڑا اور گھڑ گھڑ کر اسے کلی کلی پھیلایا۔ قزاقوں کے اس پینڈے نے مغرب کے ذہن کو بالکل مسخ کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ آج بھی سرے سے مذہب کا انکار کرنے والے اور عیسائیت سے آزاد ہو کر سوچنے والے اربابِ عقل تک جب اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اظہارِ رائے کرتے ہیں تو وہ آج سے چھ صدی قبل کے تنگ دل اور تاریک خیال پادریوں سے ذہنی سطح میں کچھ بھی لیند نہیں ہوتے۔ چنانچہ اٹھا کے دیکھ لیجئے سترقین کی کتابوں کو کہ کتنی غلط اور ناقص معلومات کس مفسدانہ طریق سے مرتب کر کے لائی گئی ہیں اور دنیا کے سب سے بُرے انسان کی تصویر کس نامعقولیت سے کھینچی گئی ہے۔ کوئی ایک آدھ اشنائی مثال مل جانا اور پینر سے، یہاں تو اس عمومی انداز کا ذکر ہے جو اہل مغرب کے ہاں پایا جاتا ہے۔

۴۔ گذشتہ دو صدی کا عہد مغربی امپیریلزم کا شیطانی عہد ہے۔ اس عہد میں مسلمان توہین اسلام سے انحراف، خدا سے بغاوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں سے گریز کی منرا پلنے کے لیے ایک ایک کر کے مادہ پرست مغرب کے تہنشاہی عزائم کی شکار ہونے لگیں۔ مغرب کے تہنشاہی عزائم کو مسلمانوں کے اندر ہر جگہ ایک سخت درجہ کی مزاحم روح کار فرمائی اور یہ روح ہر جگہ مذہبی روح تھی۔ اسلام نے توحید کا جو تصور دیا ہے وہ حریت و آزادی اور مساوات کے ایسے اسوات اجاتا ہے کہ جو اسلام کے ماننے والوں کو غلامی پر رضامند نہیں بنو دیتے۔ چنانچہ مسلمانوں کے اندر مغربی امپیریلزم کے خلاف جتنی بھی تشریکیں برپا ہوئی ہیں ان کے اندر اسلام کی حرارت کام کر رہی تھی ہر جگہ وہی شخصیتیں

رہنمائی کرتی نظر آتی ہیں اور ہر جگہ نظام اسلامی کے ایجاد کے ولولے کا فرما رہے ہیں۔ اسی طرح مسلمان ممالک کی تمام تحریکات آنٹادی میں دینی داعیہ پورے زور سے برسر عمل ملتا ہے۔ چنانچہ مغرب کے شہنشاہی صیادوں میں اس قوت کے خلاف از سر نو ایک چڑ پیدا ہوئی جو قدم قدم پر ان کا راستہ روکتی تھی اور بار بار نا قابل تسخیر ولولے ابھارتی تھی۔ چنانچہ اس چڑ کی وجہ سے مسلمانوں کی مذہبیت کو جنونی پن سے تعبیر کیا گیا اور ملازم کو ایک خوفناک ہتھیار بنا کر پیش کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی رُوح دینی کچھ ایسی سخت جان پائی گئی کہ جو آسانی سے مغربی فکر اور کلچر کے سامنے تسکت کھلنے والی نہیں تھی بلکہ جس نے ہر سپردیس میں اس کا مقابلہ کیا ہے۔ تعلیم اور لٹریچر اور اثر اندازی کی پوری قومیں صرف کر کے مغربی امپیریلزم نے برسوں میں جا کر مسلمان قوموں کے اندر سے اپنے حق میں ایک معمولی سی اقلیت حاصل کی اور اسے سہارا دے کر اقتدار تک پہنچایا اور پھر اسے مسلمانوں کے اسلامی رجحانات کے خلاف فکری، سیاسی و تہذیبی معرکے میں خوب خوب استعمال کیا۔ ان حالات میں اسلام اور اسے پیش کرنے والی ہستی سے مغرب کا کھچاؤ بڑھتا ہی گیا۔

۴۔ مغربی قومیں جب مسلمانوں کو غلام بنانے میں کامیاب ہو گئیں تو ان کے لیے یہ مشکل ہو گیا کہ جو طاقت سیاسی و مادی اور تنظیمی و تہذیبی لحاظ سے ان سے بہت ہے وہ اس سے نظریہ زندگی اور نظام حیات کا درس لے سکیں اور اسے برپا کرنے والی ہستی کا احترام کر سکیں۔ پھر جب مسلمانوں کو انہوں نے اپنی ذہنی تقلید میں مبتلا دیکھا اور ان پر مروجہ بیت کی کیفیت کی پرچھائیں پڑی دیکھی تو اس چیز نے اور بڑی رکاوٹ پیدا کر دی۔ انہوں نے جب اپنے تیار کردہ روشن خیال مسلمانوں کو اسلام کو مغربی نقطہ نگاہ کے مطابق ڈھانے دیکھا تو اسلام اور اس کے داعی کی وقعت ان کی نگاہوں میں اور کم ہو گئی۔ مسلمانوں کے معذرت خواہانہ نقطہ نظر نے اسلام کے وقار اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو بڑا نقصان پہنچایا۔

ان سارے وجوہ و اسباب کے تحت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مغرب کے انسان کے درمیان

اپنی دیواریں کھری ہو گئیں۔

آج مغرب محسن انسانیت کو محض مسلمانوں کے گروہی رہنما کی حیثیت سے لیتا ہے اور سمجھنے سمجھانے کے نقطہ نگاہ کے بجائے معترضانہ اور مخالفانہ اور مناظرانہ ذہن کے ساتھ سیرت کا مطالعہ کرتا ہے۔ چنانچہ مغرب نے اس بلند مرتبہ ہستی کی جو تصویر اپنے لٹریچر میں تیار کی ہے وہ ایک ایسے آدمی کا نقشہ سامنے لاتی ہے جو نفسیاتی صحت و توازن سے محروم ہے، جس کی ساری تنگ و دو لا شعوری محرکات کے رد عمل سے پیدا شدہ خبط کا نتیجہ ہے، وہ تیغ و خونخوار ہاتھ میں لیے جہر پڑھتا ہے قتل عام کرتا چلا جاتا ہے۔ اس پکیر رحمت کو ایک دنیا طلب اور جاہ پسند جنگجو کامرتبہ دے دیا گیا ہے اور اس کے مخلصانہ کام کو ایک فراڈ بنا دیا گیا ہے۔ یہ دکھایا گیا ہے کہ تحریک اسلامی میں جو جو کچھ اچھے پہلو تھے وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے متعارف کیے گئے تھے، ورنہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر اپنا کوئی جوہر قابل نہ تھا۔ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ روحانیت و مذہبیت کا سارا رنگ تو محض نمائشی تھا اور محض ڈرامائی تدابیر سے تسخیر عوام کر کے اپنی مطلب براری کی گئی تھی۔ آپ جسے بھی چاہیں دنیا پرست اور حیلہ ساز آدمی کہہ سکتے ہیں، مگر سوال یہ ہو گا کہ ایسی شخصیت کے اندر اس طرح کا اعلیٰ اور بے داغ کردار کس طرح کھپایا جاسکتا ہے جس کا تجربہ ہمیں سرعہ عالم کی پوری زندگی میں ہوتا ہے۔

پھر ظلم یہ ڈھایا جاتا ہے کہ اس صاحب دعوت ہستی کے پیش کردہ پیغام کا مطالعہ جڑ سے شروع کر کے نہیں ہونا چاہیے اور برگ و باز تک نہیں پہنچا جاتا بلکہ اساسی نظریہ کو کچھ بغیر اور فکر کی جڑ کی ماہیت متعین کیے بغیر مناظرہ باز پادریوں کے بیچ پر پڑ کر حیثیاتی مسائل کی چند کونسلوں کو لے لیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ داعی اسلام نے تعدد ازدواج کو جائز رکھا۔ مذہب کے لیے تلوار اٹھائی، جنگی قیدیوں کو غلام بنانا جائز قرار دیا اور زلماں موقع پر یوں کیا اور زلماں معاملے میں یوں کیا۔ یہ طریق مطالعہ ہمیشہ متعصب اور مخالفانہ ذہن کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کے ذریعے کسی نظام زندگی کو اور کسی دین کو سمجھا نہیں جاسکتا بلکہ اس کے ذریعے تو بات کو سمجھنے کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

دیکھنے اور جاننے اور سمجھنے کی اصل چیز نظریہ اساسی ہے کہ وہ کہاں تک برحق ہے۔ اور اس سے زندگی کی بگڑی کہاں تک بنتی ہے۔ پھر اس نظریہ سے ماخوذ ہونے والے اصول دیکھے جاتے ہیں کہ جن پر زندگی کے مختلف شعبے استوار ہوتے ہیں۔ پھر ان اصولوں کے فریم میں جزئیات کی ترتیب دیکھی جاتی ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک قائم ہوتی ہے کہ نہیں۔ ایک شخص آپ کے سامنے زندگی کا ایک فلسفہ لے کے آتا ہے، آپ اس فلسفہ پر غور کرنے کے بجائے چند ایسے جزئی مسائل چھیڑ دیتے ہیں جن کے بارے میں آپ کے معاشرہ کا ایک خاص ذہن بنا بنایا چلا آتا ہے اور اس ذہن سے باہر نکل کر آپ سوچ نہیں سکتے نتیجہ یہ کہ خود مغالطوں میں پڑتے ہیں اور ہزار ہا لوگوں کو تعصب میں مبتلا کرتے ہیں۔ ایک شخص انسانیت کا ایک مکمل نیا نقشہ اپنی ذات میں بنا کر سامنے آتا ہے، آپ اس نقشے کو مجموعی طور پر سمجھنے سے قبل اس کی دو ایک لکیروں اور نشانوں کو پکڑ کر بحث شروع کر دیتے ہیں کہ یہ لکیروں اور یہ نشان یوں کیوں لگائے گئے ہیں۔ حالانکہ اگر نقشے کی مجموعی ترتیب کو دھنگ سے سمجھا گیا ہوتا تو ان لکیروں اور نشانوں کی ماہیت بھی از خود سمجھ میں آجاتی۔ مغرب نظریات اور نظاموں کو سمجھنے کے لیے اور تاریخی شخصیتوں کا جائزہ لینے کے لیے جو انتہائی سائنٹفک انداز بالعموم استعمال میں لاتا ہے، وہی اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کرتے وقت بالکل بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک باغ پر رائے قائم کرنے کے لیے اس کو مجموعی حیثیت سے سامنے رکھنا ہوتا ہے، نہ کہ اس کے اندر کی گھاس کی دو ایک پتیوں اور کسی پودے کی کوئلوں کو سارے باغ سے الگ کر کے زیر مطالعہ لایا جاتا ہو۔ آپ سیرت محمدی اور پیغام محمدی کے پورے چمن کو دیکھیں اور اس کی مجموعی ترتیب کو سمجھیں، پھر آپ کو اس کے اندر ایک ایک شاخ اور ایک پتی کا مقام خود ہی سمجھ میں آجائے گا۔ اگر کسی نظام یا نظریے یا تحریک، یا قائدانہ شخصیت میں چند چیزیں آپ کے ذوق اور آپ کی پسندیدہ روایات اور عادات کے خمد ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ بس وہاں کوئی قابل قدر چیز ہے ہی نہیں اور وہ پورا مجموعہ متروک کر لینے کے قابل ہے۔ آخر آپ کا ذوق اور آپ کی پسند کوئی عالمی و تاریخی معیار نہیں ہے، ممکن ہے بلکہ لازم ہے کہ ایک نظریہ، نظام، تحریک اور قائدانہ شخصیت اپنا معیار خیر و شر اپنے ساتھ لائے اور

سرے سے اس کے بھلے برے کے پیمانے ہی آپ سے الگ ہوں۔ لہذا سب کے پہلے تو معیار اور پیمانوں کو بالمقابل دیکھ کر جانچنا چاہیے اور معیار اور پیمانوں کو جانچنے سے قبل اساسی نظریہ کی قدر و قیمت متعین ہونی چاہیے۔

قرآن مہم اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو لٹریچر باب کلیسا اور مستشرق مورخین نے اب تک پیدا کیا ہے وہ ایک طرف غلط فہمیوں اور جہالتوں سے بھرا پڑا ہے اور دوسری طرف معاندانہ تعصب کا زہر اس کی رگ رگ میں پھیلا ہوا ہے بلکہ حد یہ ہے کہ جن لوگوں نے وسیع قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعتراف حقیقت کیا بھی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر تعریفی انداز تک اختیار کیا ہے انہوں نے بھی ایسے ایسے بیٹھے ڈنگ سحر آگین الفاظ کے پردوں میں رکھ دیئے ہیں کہ آدمی فریب نگارش کے اس انداز کی داد دیتا رہ جاتا ہے۔ دو چار دھشائیاں مثالیں ایسی ضرور ملتی ہیں کہ جنہوں نے حضور کے پیغام اور کارنامے کو دلی اعتراف کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مگر وہ خود انہیں مغرب کے دل و دماغ نے کچھ زیادہ قدر و قیمت دی نہیں۔ مثلاً حال ہی میں ایک کتاب ذرا بہتر انداز کے ساتھ آئی ہے تو اسے ”در مدح مسلمین“ (PRO-MOHAMMADEN) قرار دے کر اس کی وقعت گھٹائی جا رہی ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ مسلمان مملکتوں سے آج مغرب کی ڈیپلوٹیک اغراض وابستہ ہو رہی ہیں ان کے تحت ان اقوام کی تالیف قلب کے لیے جانے کیا کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں، لیکن کہیں بھی اس ظلم کی تلافی کی فکر نہیں کی گئی جو سرورِ عالم کے ساتھ اب تک روا رکھی گئی ہے۔

تقاضا یہ نہیں کہ آپ ضمیر کی آواز کے خلاف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نظریہ و نظام کی صداقت کی گواہی دیں، نہیں آپ اختلاف کریں اور پورے زور سے کریں۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے اپنے ہی بنائے ہوئے، اپنے ہی تسلیم کردہ اصولوں اور معیارات کو توڑ توڑ کر حقائق کو مسخ نہ کریں۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ ایسے ماخذ سے روایات نہ لیں جو ایک طرف مسلمانوں کی نگاہ میں بالاتفاق ناقابل استناد ہیں اور جنہیں تاریخی تحقیق کے مسلمہ معیارات قبول نہیں کر سکتے تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ ایک واقعہ کے اچھے محرکات کو ہٹا کر ان کی جگہ دانستہ مکرہ

محرمات لاکر نہ رکھیں تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ دلائل سے بات کہیں، طنز و تعریض اور توہین و تذلیل کا غیر شرفیقا نہ طہب اختیار نہ کریں۔

اس گفتگو سے ہمارا مدعا ایک ناخوشگوار جذباتی فضا پیدا کرنا نہیں بلکہ اب تک جو فضا موجود رہی ہے ہم چاہتے ہیں کہ اسے ختم کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے شرط اول یہ ہے کہ مغرب اسلام قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے نقطہ نظر کو صاف کرے۔ ایک نئے ذہن کو برٹھے کار لانے کی ضرورت ہے اور وہ نیاز ہیں اس کلمہ سواد یا نقطہ اشتراک کو سمجھنے سے پیدا ہو سکتا ہے جو اہل مغرب اور مسلمانوں کے درمیان واقع ہے۔ ہمارا کلمہ سواد ذیل کے مشترک نکات سے بنتا ہے:

— عیسائی، یہودی اور مسلمان تینوں خدا پرست گروہ ہیں، تینوں کے ہاں آخرت کا تصور موجود ہے، تینوں کی عبادات کا طرز متما ہے، تینوں کے نزدیک نیابتی اخلاقی اقدار یکساں ہیں۔

— تینوں کی مذہبی تعلیمات ایک ہی الہامی سرچشمہ سے ماخوذ ہیں اور مسلمان جملہ انبیاء کو ایک ہی عظیم صداقت اور ایک ہی دین کے علمبردار مانتے ہیں۔

تمدنی حیثیت سے دیکھیں تو اہل مغرب اور مسلمانوں کے درمیان ذیل کے نقطہ ہائے اتحاد موجود ہیں:

— مغربی تمدن نے علم اور سائنس کی ترقی کی جو راہیں کھولی ہیں، مسلمانوں کا خالص مذہبی نقطہ نظر ان ترقیوں کا قدر شناس ہے اور اسلامی نظریات روحانیت کے ساتھ ساتھ اپنے تمدن میں اس مادیت کو جگہ (مقہوری ہی حدود کے ساتھ) دے سکتے ہیں جس میں مغرب نے عروج حاصل کیا ہے۔ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام دین اور نظام ہونے کی وجہ سے زیادہ وسعت نظر رکھتا ہے۔

— جمہوریت کے جن اصولوں کے ساتھ مغربی تمدن نے سیاسی حیثیتیں استوار کی ہیں پھر ان اسلام کی فکر میں وہ پہلے سے شامل ہیں۔ بلکہ ان کا مکمل ترین مظاہرہ کرنے میں اسلامی تمدن ہی نے سبقت کی ہے۔ نمائندگی و انتخاب، شورایت، قانون کی عملداری، شہری

حقوق اور ان میں مساوات کے سارے تصورات کو مسلمانوں نے مغرب سے پہلے
جاہلہ عمل پہنا یا ہے۔ اگرچہ وقت کے تمدنی و معاشرتی ماحول کی مطابقت میں؛
عالمی کچھا ڈاؤن بحران کو پیش نظر رکھیے تو اس کا حل تلاش کرنے میں بھی دو وجوہ سے مسلمانوں ہی کا
تعاون مغرب کے اصلاح پسندوں کے لیے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے:-

-- اگر مغرب سنجیدگی و اخلاص سے سوچے تو امن عالم کے مسئلے میں قہراً تعاون مسلمان
بیم پہنچا سکتے ہیں اتنا اور کسی عنصر سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی گروہ اعتقاد ذاتی
محبت انسانیت رکھتا ہے اور جهانی وحدت کے لیے ایسی اصولی بنیادیں رکھتا ہے
کہ اگر اسے پوری طرح کام کرنے کا موقع ملے تو بین الانسانی تضادوں کا انسداد
ہو سکتا ہے۔ مستقبل کے عالمی نظام کی تعمیر کے لیے اصول و اقدار کا مسالہ اسلام
وافر حد تک مل سکتا ہے۔

— مادیت کی دو انتہا پسندانہ اشکال — یعنی سرمایہ پرستی اور کمیونزم — دونوں کا
مقابلہ کرنے اور ایک درمیانی راہِ عدل پر انسانیت کو لانے کے کام میں اسلام اور اس
کے پیروؤں ہی سے کچھ زیادہ امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

غور و فکر کے لیے یہ مشترک نکات سامنے رکھ کر ہم کہتے ہیں کہ کیوں نہ اہل مغرب اب محمد صلی اللہ علیہ
و سلم کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بدلیں۔ کیوں نہ وہ پادریوں اور مشنریوں کے حائل کردہ پردہ ہائے تعصبات
کو پارہ پارہ کر دیں۔ آج جبکہ ایک طرف مادی نظریہ کا تجربہ دل کھول کر کیا جا چکا ہے اور اب اس تجربہ
کو اسی ڈھب سے آگے جاری نہیں رکھا جاسکتا، پھر یہ شاخسارِ حکمت اب نئی کونسلیں بھی نہیں چھوڑ رہا ہے جن کو
مرکزِ امید بنا کر کچھ اور وقت گزارا جاسکے، دوسری طرف جو مذاہب موجود ہیں ان میں سے ہر ایک فرد
کی زندگی کے ایک گوشے میں سکڑ کر رہنا پسند کرتا ہے مگر آگے بڑھ کر زمام تمدن ہاتھ میں لینے کے لیے
تیار نہیں ہے۔ گویا ہم نظریاتی لحاظ سے ساری پونجی ختم کر کے بالکل دیوالیہ ہوئے ٹھہرے ہیں۔ دے دے
ایک مرکزِ توجہ باقی ہے جہاں سے شعاعِ امید چھوڑتی ہے، اس کے لیے بھی اگر دلوں کے دروازے بند

کر لیے جائیں تو آخر مرتح سے تو کوئی رہنمائی دے آئے نہیں کی جاسکتی۔

وقت ہے کہ آپ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تاریخ ساز، ایک محسن انسانیت، ایک قائد تمدن، اور ایک انسان اعظم کی حیثیت سے جانیں۔ جو روشنی وہاں سے ملتی ہے اس کے لیے دل و دماغ کے درتپے کھول دیں۔ یہ ہستی مستحق ہے کہ اسے آپ سائنٹفک طریق سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ چاہیے یہ کہ آپ اسلام کو عیسائیت کے ایک فزقی مذہب کی حیثیت سے نہ لیں بلکہ جمہوریت، اشتراکیت اور دوسری اصولی تحریکوں کی طرح کی ایک تحریک اور زندگی کے ایک تہذیبی نظام کی حیثیت سے لیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تحریک کے قائد اور اس نظام کے مؤسس کی حیثیت سے دیکھیں جنہوں نے ایک عظیم اور روشن دور تاریخ کا افتتاح کیا۔ اس ہستی کے پیش کردہ اصولوں کو آپ اس لحاظ سے جانچیں کہ وہ ایک جهانی ریاست چلانے کے لیے آج کہاں تک مفید اور ناگزیر ہیں۔ اس کے تیار کردہ نمونہ انسانیت کا مطالعہ اس مقصد سے کریں کہ یہ نمونہ جو ہماری دور کی تہذیب کا کل پرزہ بننے کے لیے کس حد تک موزوں ہے۔

آج جبکہ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہمارے سامنے ہے اور دور دور تک کوئی جگنو بھی چمکتا دکھائی نہیں دیتا پیچھے پلٹ کر نظر ڈالتے ہیں تو محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں ایک مشعل جھللاتی دکھائی دیتی ہے جو گذشتہ پانچ سو صدیوں سے آندھیوں اور طوفانوں کے درمیان ایک ہی شان سے جل رہی ہے۔ کیا محض خود پیدا کردہ تعصبات اور غلط فہمیوں کی بنا پر اس مشعل کی روشنی کو قبول کرنے سے انکار کر دینا اور اپنی آنکھوں پر ٹپی باندھ لینا کوئی اچھا نتیجہ دے سکے گا؟ کیا انسانیت و تہذیب کو اس اندھیرے میں تباہ و برباد ہونے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ خوب سوچ لیجئے کہ حالات ہمارے سامنے کتنا خوفناک چیلنج لیے کھڑے ہیں اور آیا آپ میں اس کا جواب دینے کی

سکت موجود ہے (باقی)